اردو افسانہ اور نفسیاتی مسائل

(ناسازگار حالات کے تناظر میں)

راحیلہ بشیر

ABSTRACT:

It is a complicated process to understand human psychology. Man has both good and evil, is striving with the crown of being the supreme creature. However, it has been evidently seen that in the absence of supremacy of law, this bearer of humanity descends to the level of damnation and commits in human acts. This kind of characters have been presented with remarkable skill in short stories written in the context of advent of Pakistan and Fall of Dhaka. The short story writers are seen there, arguing strange and ambiguous psychy of such characters. We are bound to conclude after analysing these characters that man infact persues the sanctity of social norms and values, however when there is disintegration in societal laws, the attitudes deteriorate accordingly and such acts are committeed that are beyond national comprehension.

انسانی نفسیات کو سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پیچیدہ و دشوار گزار راستے سے گزرنا۔ ایک انسان نیکی اور بدی کا مرقع ہوتا ہے۔ وہ حقیقتاً کیا ہے اس کا اندازہ لگانا تادم مرگ ناممکن ہے۔ تغیر و تبدل اس کی زندگی کا حصہ ہیں۔ اچھے کردار ہمیشہ اچھے نہیں رہتے وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ برے بھی ہو سکتے ہیں اسی طرح برے کردار بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو انسان خود اپنے بارے میں رائے قائم کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ کبھی تو وہ خود فریبی کے عمل سے گزرنے لگتا ہے تو کبھی ساری دنیا کو دھوکے میں رکھنے کی کاوش میں لگا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود ایک معما بن کے رہ جاتا ہے۔ اس سے سرزد ہونے والے افعال ارادی بھی ہوتے ہیں اور غیر ارادی

بھی۔ اخلاقیات کا تعلق کردار کے ارادی افعال سے ہوتا ہے۔ اخلاقیات ایک معروضی حقیقت ہے یہ بات مختلف کرداروں پر منحصر ہے کہ وہ اسے اپناتے ہیں یا رد کرتے ہیں انسان اور اخلاقی اقدار کی وضاحت کرتے ہوئے ساجدہ زیدی اپنی کتاب ''انسانی شخصیت کے اسرار و رموز'' میں لکھتی ہیں:

> ''اس خارجی سماجی نقطہ نظر کا نتیجہ یہ تھا کہ افراد بھی یہی سمجھتے تھے کہ جن اقدار کو انھوں نے نفسیاتی طور پر اپنا لیا ہو یا جو انھیں ورثے میں ملی ہوں وہی ان کی اقدارِ حیات ہوتی ہیں مثال کے طور پر ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے اور خاندانی اقدار کو نظریاتی طور پر بے چون و چرا قبول کرنے والا فرد یہ سمجھتا تھا کہ اقدار کا چشمہ اول ذات باری تعالیٰ ہے ..... اگر ان افراد کا عمل ان اقدار سے کلی طور پر مشابہ نہیں ہوتا تھا تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ اقدار تو مطلق ہوتی ہیں ان پر عمل پیرا ہونا فرد کا اپنا فعل ہے، فرد کے عمل سے قدریں تو بدل نہیں سکتیں۔'' (۱)

ان معروضی اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہونے سے انسان ذہنی اور روحانی طور پر آسودگی محسوس کرتا ہے۔ ایک صحت مند معاشرے میں نہ صرف یہ اخلاقی اقدار پنپتی ہیں بلکہ صحت مندانہ انسانی مشاغل و رویے بھی پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن جب یہی معاشرہ انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے تو انسان کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ قانون کی بالادستی ختم ہوتے ہی انسان کی شیطانی صفات ابھرنے لگتی ہیں یہاں تک کہ وہ انسانیت کے درجے سے بھی گر جاتا ہے۔ سازگار حالات اور ناسازگار حالات میں ایک ہی کردار کی نفسیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس بات کی وضاحت کسی حد تک فرائیڈ (Frud, Sigmund) (۱۸۵۶ء۔۱۹۳۹ء) کے اس نظریے کے تحت کی جا سکتی ہے۔ جو انسانی ذہن کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اِڈ (Id)، ایگو (Ego) اور سپر ایگو (Super Ego) ڈاکٹر نعیم احمد، فرائیڈ کے نظریات کی وضاحت اپنی کتاب ''فرائیڈ کی تحلیل نفسی'' میں کرتے ہیں۔ ہماری جبلتوں یا جسمانی ضرورتوں کا ذہنی اظہار 'اِڈ' کے ذریعے ہوتا ہے وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''فرائیڈ کے نزدیک اِڈ ایک ایسی خفیہ نفسی حقیقت ہے جو تمام تر موضوعی ہے۔ اسے خارجی دنیا کا علم نہیں۔ نہ ہی اس کے اندر منطق، مذہبی، اخلاقی یا سماجی حقائق سے آگہی پائی جاتی ہے۔ یہ توانائی کا ایک سمندر ہے جو ہر دم متلاطم رہتا ہے۔ آزاد توانائی ہونے کی وجہ سے اِڈ اپنی تسکین و تکمیل کے لیے اہداف بدلتی رہتی ہے۔ اسے زبردست قوت حاصل ہے اور اگر اسے اپنی تکمیل کے لیے خارجی دنیا کے اسباب نہ بھی میسر آئیں تو یہ خود واہموں، خوابوں، تمثیلوں اور شبیہوں کی دنیا تخلیق کر لیتی ہے اس کے صرف دو مقاصد ہیں، الم سے احتراز اور لذت کا حصول۔'' (۲)

'ایگو'، 'اِڈ' کا ترمیم شدہ حصہ ہے۔ یہ جبلی جذبات کو محسوس کر لیتا ہے اور حقیقت کی دنیا میں اِن کو اس طرح پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ بیرونی اور اندرونی اخلاقی معیار کے مطابق ہو 'ایگو' کے حوالے سے فرائیڈ کا نظریہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نعیم احمد مزید لکھتے ہیں:

''ایغو کی بدولت عضویہ ماحول سے مطابقت اختیار کرتا ہے، ایغو وہ دیدۂ بینا اور خضر راہ ہے جو ماحول کی سختی گرمی اور سماجی حقائق کی اونچ نیچ کے پیش نظر اِڈ کی رہ نمائی کرتا ہے..... چناں چہ ایغو اِڈ کو یہ تربیت دیتا ہے کہ وہ حصولِ لذت کی طلب کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک خارجی دنیا میں مطلوبہ شے کے مل جانے کا امکان پیدا نہ ہو جائے۔'' (۳)

'ایگو' کا ایک حصہ مزید ترمیم پا کر ایک بالکل مختلف قسم کا کام سرانجام دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس حصے کا نام فرائیڈ نے 'سپر ایگو' رکھا ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ 'اِڈ' کی بے لگام جبلی خواہشات پر قابو پایا جائے۔ چناں چہ اس کی وضاحت ڈاکٹر نعیم کچھ یوں کرتے ہیں:

''اسے ہم شخصیت کا اخلاقی اور عدالتی شعبہ بھی کہہ سکتے ہیں، یہ اصولِ حقیقت یا اصولِ لذت کی بجائے کسی نصب العین یا آدرش کا غماز ہوتا ہے اور اعمال و افعال کو معیاری و مثالی بنانا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے شخصیت کے لیے ''اخلاقی ضابطے'' کا نام دے سکتے ہیں۔ بچہ جب اپنے والدین کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ کن امور کو صواب و ناصواب، خیر و شر یا جائز و ناجائز سمجھتے ہیں تو اس کے ایغو میں سے سپر ایغو ایک اخلاقی شعور کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ یہ اخلاقی شعور بتدریج بچہ کی شخصیت میں اپنے والدین کے استناد و اختیار کی جگہ لے لیتا ہے۔ یعنی بچہ ایک عرصے تک اپنے والدین کی اتھارٹی کے حوالے سے گناہ اور ثواب، اچھے اور برے، خیر و شر سے متعارف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بہ تدریج والدین کی یہ اتھارٹی خود اس کی اپنی شخصیت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔'' (۴)

گویا 'اِڈ' کی بے لگام خواہشات کی وجہ سے فرد تمام اخلاقی اقدار کو قید سمجھتا ہے اور اس قید سے آزاد ہونے کی شدید خواہش رکھتا ہے، لیکن سپر ایگو اس پر اخلاقی اور مذہبی حوالے سے کڑی پابندیاں لگا دیتا ہے جب کہ ایگو ایک درمیانہ راستہ اختیار کرتا ہے اور اخلاقی اقدار میں رہتے ہوئے ایگو کی بے لگام خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایم۔اے قریشی ''فرائیڈ اور لاشعور'' میں اس کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

''۔۔۔اس اشرف المخلوقات انسان کے اندر اس سپر ایگو کی تشکیل نے مذہب، اخلاق اور تہذیب کی بنیادیں رکھ کر اس کو اور بھی بلند مرتبت بنا دیا ہے کیونکہ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ اِڈ کی بے لگام جبلی خواہشات کی تسکین کے تکلیف دہ انجام سے بچانا۔ ۔۔اگر سپر ایگو زیادہ سخت گیر نہ ہو تو انسان اس اندرونی تبدیلی کی وجہ سے اچھا خاصا حقیقت پسند بن جاتا ہے اور اپنی جبلی خواہشات کی تسکین کئی ایسے مہذب طریقوں سے بھی کر لیتا ہے جو سوسائٹی کے معیار کے مطابق ہوتے ہیں۔'' (۵)

اس طرح ایگو اور سپر ایگو انسان کو سوسائٹی کے معیار کے مطابق چلنا سکھاتے ہیں لیکن ناسازگار حالات میں جب قانون کی بالادستی قائم نہیں رہتی اور انسان کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ اِڈ کا ماتحت ہو جاتا ہے اور ایک انسان وہ

کچھ کر گزرتا ہے کہ اس کا انسان ہونا بھی شک وشبہ کے دائرے میں آجاتا ہے۔انسانی نفسیات کا یہ نظام بگڑ جاتا ہے جو قدرت کی طرف سے اسے ودیعت کیا گیا ہے۔چنانچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد،مختلف جنگوں کے دوران اور سقوطِ ڈھاکا کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں ہمیں کرداروں کی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔جو اپنی نفسیاتی خواہشوں کے تحت غیر انسانی رویوں کی پیش کش کرتے نظر آتے ہیں۔

ناسازگار حالات انسان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور جب یہ سوچیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتیں اور بہت سے سوالات انسان کو بے چین کر دیتے ہیں تو انسانی ذہن کش مکش کا شکار ہو جاتا ہے۔تقسیم ہند کے ہنگاموں کے دوران انسان کو ایسے ایسے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ ایک لمحے کے لیے سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ مذہب کیا ہے؟ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی شناخت کیا ہے؟ یہ تمام سوالات اس وقت اٹھائے جاتے ہیں جب حالات و واقعات انسان کی سمجھ سے باہر ہو جائیں۔ ہر طرف قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا سامان گرم تھا عورتیں اغوا کی جاتیں۔بچوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا جاتا۔مجبور ہو کر لوگوں کو اپنا گھر بار، وطن سب چھوڑ چھاڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔اس قسم کے حالات میں تو کوئی بھی اپنے حواس کھو سکتا ہے۔فسادات ،ہجرت، بے وطنی اور بچھڑے ہوؤں کی یادوں جیسے مصائب سے گزرنے والے لوگ مختلف قسم کی نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو گئے۔اس کے علاوہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے بھی مختلف نفسیاتی مسائل کا شکار تھے۔فسادات کے دوران انسان کی جبلی خواہشات،تشدد،جنسی تسکین اور غصہ پوری شدت کے ساتھ اُبھرتے نظر آتے ہیں۔اس کی وضاحت ڈاکٹر نعیم ''فرائیڈ۔۔۔نظریہ تحلیلِ نفسی'' میں کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''جبلّت کا معروض وہ شے یا وسیلہ ہے جس سے جبلّت کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔بھوک کی جبلّت کا معروض کھانا،جنس کی جبلّت کا مباشرت اور تشدد کی جبلّت کا لڑائی جھگڑا ہے۔یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جبلتوں کے معروض یا وسیلے حالات وواقعات سے بدلتے رہتے ہیں۔ایک جبلّت کی تکمیل کے وسائل دوسری جبلّت کے وسائل کی جگہ لے سکتے ہیں۔جنسی جبلّت کی تسکین کا معروض تشدد کی جبلّت کے معروض کی جگہ لے سکتا ہے۔''(۶)

''مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد'' میں انور سجاد کا افسانہ 'نہ مرنے والا' اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔اس کا مرکزی کردار اپنے دوست کا قتل کر دیتا ہے لیکن اس کے اندر کا انسان اسے ملامت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے۔وہ اپنے دوست کے ساتھ ڈی سوزا کے کیفے میں اکثر جایا کرتا تھا۔قتل کے بعد وہ کیفے کی طرف چل پڑتا ہے لیکن اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دوست زندہ ہے اور مستقل اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ڈی سوزا کے کیفے پر پہنچنے کے بعد اسے لگتا ہے کہ اس کا دوست باہر سڑک پر کھڑا ہے۔اس وہم کو حقیقت مان کر وہ سڑک کی طرف دوڑتا ہے اتنے میں کرفیو کا سائرن بج جاتا ہے تو ڈی سوزا اسے اپنے کیفے میں واپس کھینچ لاتا ہے اب وہ اپنے دوست کو قتل کیوں کرتا ہے؟ یہ ایک الگ معما ہے۔انسانی نفسیات کا معما۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فسادات کے دوران اس کو اپنی نفرت کے اظہار کا موقع مل جاتا ہے۔نہ قانون ہے نہ پکڑ ہے ہر کوئی آزاد ہے ہر شخص کا اپنا قانون ہے۔افسانے کا مرکزی

کرِدار سوچتا ہے:

''گوروں کی غلامی سے نجات پانے کا عمل شروع ہو چکا ہے اور میرے ہم وطن دیوانگی میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے وجود ہی سے آزاد کر رہے ہیں۔نفرت کو نفرت سے ذبح کر رہے ہیں۔بلیدان جھٹکا گھروں کو جلایا جا رہا ہے۔لیکن مجھے کیا! آج ہر انسان کا اپنا ہی قانون ہے اور ہر کوئی اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو میں بھی کیوں نہ اٹھاؤں میں آج یہ موقع نہیں جانے دوں گا۔''(۷)

اس آزادی کے باوجود احساس جرم اس کو نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ اس کا دوست زندہ ہے جب وہ ڈی سوزا کے کیفے کی طرف جا رہا تھا تو اسے بوٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دوست مرا نہیں بل کہ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

''نہیں میرے بوٹوں کی آواز اتنی نہیں ہو سکتی وہ میرا پیچھا کر رہا ہے تصویر کے پیچھے سے نکل کر۔۔۔وہ وہ مجھے پکڑ لے گا اور پھر ساری عمر۔۔اس کے قدم تیز ہو گئے ہر مکان کے بند دروازوں سے چرچراتے ٹک ٹک کرتے بوٹ اُترنے لگے،دوڑو۔۔۔ پکڑو۔۔۔قاتل کو پکڑو۔۔بھاگنے نہ پائے۔قدموں کی آواز اور تیز،اور تیز۔۔۔۔اور قریب،اور قریب۔دوسرے کھمبے سے گزرتے ہوئے ایک سایہ سا اس کے پیچھے سے نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا،میں نے،میں نے کچھ نہیں کیا۔مجھے نہ پکڑو۔میں نے قتل نہیں کیا۔میرا ہاتھ تو کانپ گیا تھا۔لمحہ تو میرے ہاتھ سے پھسل گیا ہے۔میں،تم،میں۔''(۸)

کیفے میں ڈی سوزا اس سے پوچھتا ہے کہ تمہارا فرینڈ کدھر ہے تو اسے لگتا ہے اس کا دوست سڑک میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔اس حوالے سے غیاث الدین اپنی کتاب ''فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے'' میں لکھتے ہیں:

''افسانہ نگار نے پینٹنگ،اس کا رنگ،پگھلتی ہوئی موم کے لمحوں کی علامتوں کا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔قاتل کی ذہنی کیفیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دوست قتل ہونے پر بھی نہ مر سکا جو اس کے شعور میں زندہ ہے لیکن جیسے وہ خود مر چکا ہے۔مرنے والا زندہ ہے۔مارنے والا مر گیا ہے۔فرقہ واریت اور فرقہ پرستی کے زعم میں آدمی نفسیاتی الجھنوں کا کس طرح شکار ہو جاتا ہے اور خیر کے احساسات اسے کس طرح کچوکے لگاتے رہتے ہیں،کی بہترین ڈرامائی پیش کش اس افسانے میں کی گئی ہے۔''(۹)

منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' کا مرکزی کرِدار ایشر سنگھ ہے۔وہ ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کرنے لگتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ لڑکی مر چکی ہے تو اس کے حواس اڑ جاتے ہیں اور وہ نفسیاتی طور پر نامردی کا شکار ہو جاتا ہے۔ڈاکوؤں کے اس طبقے میں جہاں تہذیب کا شائبہ بھی نہیں،ایشر سنگھ ایسا کرِدار ہے جو ابھی ابھی چھ افراد کا قتل کر کے آیا ہے۔جو ابھی

ابھی ایک لڑکی کو اٹھالایا ہے تا کہ اسے ہوس کا نشانہ بنا سکے۔لیکن جب اسے پتا چلتا ہے کہ وہ لڑکی مر چکی ہے تو وہ نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ایک مردہ لڑکی سے صحبت کا تصور اس کی روح کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔جہاں ایک شخص محض برائیوں کا مرقع ہے وہاں اس کے اندر کہیں اچھا انسان بھی چھپا بیٹھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا جی دار ہونے کے باوجود اپنی داشتہ کلونت کور کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔(۱۰)

''گلی کوچے'' میں شامل انتظار حسین کا افسانہ 'قیوما کی دکان' ایک منفرد افسانہ ہے۔قیوما کی دوکان باقی تمام دکانوں سے ہٹ کر تھی کبھی بند نہیں ہوتی تھی۔ہر وقت وہاں رونق لگی رہتی تھی۔محلے کے مختلف لوگ قیوما بدھن، حسینی، رمضانی قصائی، الطاف پہلوان، کمر جی اور محلے کے دیگر افراد وہاں آ کر بیٹھ جاتے اور خوب گھڑ گھڑ کر قصے سنائے جاتے لیکن فسادات کے ہنگاموں میں یہ دکان بھی بند ہو جاتی ہے۔کرفیو کے بعد کھلنے پر بھی وہ رونق باقی نہیں رہتی۔ڈر اور خوف لوگوں کے ذہنوں پر اثرات مرتب کرتا ہے تو لوگوں کی ذہنی حالت ہی تبدیل ہو جاتی ہے:

> ''بدھن اور رمضانی اور حسینی اور الطاف اپنی پرانی ٹھیکوں پر بیٹھے تھے۔لیکن آج انھیں چپ لگ گئی تھی اور کمر جی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔چنن گھبرایا ہوا سا کھڑا تھا اور قیوما سے دو پیسے کی چاء مانگ رہا تھا۔آج واقعی اس کا یہ ارادہ معلوم ہوتا تھا کہ چائے کی پڑیالے کر جلدی سے گھر چلا جائے۔اس کے ایک ہاتھ میں پیسے بج رہے تھے اور دوسرا ہاتھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خشک ہو گیا ہے اور نقلوں کی تھال پہ مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔بدھن نے حقہ بھی بھر کے رکھ دیا تھا۔اور وہ اونچے نیچے پایوں والی بینچ بھی حسبِ معمول بچھا دی تھی۔پھر بھی ٹکنے کا کوئی نام نہ لیتا تھا۔لوگ جلدی سودا سنبھالتے اور گلیوں میں سٹک جاتے اور پھر کنواڑوں کے دہاڑ بند ہونے کی آوازیں آتیں۔''(۱۱)

''کچھ یادیں کچھ آنسو'' میں موجود اے حمید کے افسانے 'سماوار' کا بنیادی موضوع مہاجرین کی پاکستان میں کس مپرسی کی حالت ہے۔مہاجرین اتنی محنت کے باوجود پاکستان میں اپنا مقام نہ بنا سکے۔ایسا ہی ایک کردار رنگ ریز کا ہے۔اس کے گھریلو حالات نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔پھر تقسیم ہند کے وقت ہجرت کا غم۔چناں چہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔اس کا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔فسادات سے پہلے وہ فیروز والا رہتا تھا جہاں اس کی بیوی نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔بعد میں اس کے دونوں بیٹے بھی مر گئے۔بھائیوں کے ساتھ جھگڑا ہونے پر اس نے اپنی الگ دکان کھول لی۔فسادات نے اس ٹوٹے پھوٹے انسان کو مزید چکنا چور کر دیا:

> ''ابھی دوکان پر کام شروع نہ ہوا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے۔جب مجبوراً شہر چھوڑنا پڑا تو اس نے ایک رات چپکے سے مٹی کا تیل چھڑک کر اپنی دوکان میں آگ لگا دی اور پاکستان آ گیا۔۔۔ایک دفعہ کسی بات پر اس کے مالک نے اسے طیش میں آ کر ماں کو گالی دی۔اس رات وہ نیم پاگل مہاجر رات بھر اپنی کوٹھڑی میں روتا رہا اور بلند آواز میں اپنی ماں کو آوازیں دیتا رہا۔۔۔ماں کو بلاتا رہا جو فیروز پور قبرستان میں دفن تھی۔''(۱۲)

فسادات کے نتیجے میں نفسیاتی الجھنوں کا شکار لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کیا انھیں حقیقی آزادی ملی ہے کہ نہیں۔ پروفیسر احتشام حسین 'اردو افسانہ۔۔۔ایک گفت گو' کے تحت لکھتے ہیں:

''۔۔۔آزادی آئی لیکن خوشی اور مسرت کی وہ لہر اپنے ساتھ نہیں لائی جس کی تلاش تھی بل کہ بہت سے شک وشبے، بہت سی نفسیاتی الجھنیں بہت سی مادی پریشانیاں لائی، اگر چہ ہندوستان جمہوریت کی راہ اختیار کرنے کا مدعی تھا۔لیکن فوری طور پر جو حالات پیدا ہوئے انھوں نے اس شک میں مبتلا کر دیا کہ آزادی حقیقی آزادی ہے بھی یا نہیں؟ کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال سیاسی حیثیت رکھتا تھا۔لیکن زیادہ تر لوگوں کے لیے معاشی اور سماجی تھا۔''(۱۳)

قدرت اللہ شہاب کے افسانے 'یا خدا' کے مرکزی کردار دلشاد کا والد ملا علی بخش مسجد کا ملا تھا۔امریک سنگھ اسے قتل کر کے کنویں میں پھینک دیتا ہے۔تمام سکھوں کا وہم تھا کہ کنویں سے ملا کی آوازیں رات بھر سناٹے کو چیرتی ہوئی ہوا میں معلّق ہو جاتی ہیں، ایسی ڈراؤنی آوازیں جیسے بکروں کو ذبح کیا جا رہا ہو:

''سالا حرامی' امریک سنگھ کہا کرتا تھا۔''مرنے کے بعد بھی ڈکرا رہا ہے بھینسے کی طرح۔ڈال دو کچھ ٹوکرے کوڑے کے کنویں میں۔''''ارے چھوڑو بھی' امریک سنگھ کا بھائی ترلوک سنگھ مزاق اڑاتا' بانگ دے رہا ہے ملا بانگ۔''''خالصہ جی کے راج میں دھرم کی پوری پوری آزادی ہے۔''(۱۴)

امریک سنگھ کی بیوی نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ اذان کی آواز سن کر جوان عورتیں 'بانگی' جاتی ہیں بن بیاہی لڑکی بانجھ ہو سکتی ہے اور بیاہی کا حمل گر سکتا ہے۔چناں چہ امریک سنگھ کی بیوی اور بہن رات کے وقت کنویں سے آنے والی آوازوں سے ڈرنے لگتی ہیں۔مصنّف ان کی ذہنی حالت کو یوں بیان کرتا ہے:

''۔۔۔آدھی رات گئے جب مسجد کا کنواں امریک سنگھ کی بیوی کے تصور میں بھیانک اور ہولناک گونج بن کر ڈکارتا تو اس کے کانوں میں کنویں کی چنگھاڑیں جگر خراش انداز سے گونجتیں کبھی اس کے تصور میں کنوئیں کا دہانہ جبڑے پھاڑ کر اس کی طرف لپکتا اور ہر وقت اسے یہ دھڑکا سا لگا رہتا کہ ملا علی بخش کنوئیں کی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا باہر نکل رہا ہے اور چشم زدن میں کنوئیں کی منڈیر پر کھڑا ہو کر نہ جانے کس وقت اسے ''بانگ'' کے رکھ دے گا۔''(۱۵)

اسی طرح امریک سنگھ کی بہن بھی خوفزدہ رہنے لگتی ہے:

''۔۔۔لیکن پھر مسجد والے کنوئیں کی دلدوز جنگھاڑ اس کے ایوان تصور کو مسمار کر کے رکھ دیتی اور معاً اسے محسوس ہوتا کہ کنویں کی عمیق گہرائی سے بھی ملا علی بخش کالے جادو کے بول پکار پکار کر اس کے پیٹ سے چلنے والی نسلوں کے ناکے بند کر رہا ہے۔''(۱۶)

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'میں انسان ہوں' ان کے مجموعے ''درودیوار'' میں شامل ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار بتانا چاہتا ہے کہ میں انسان جو حق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔حق کی اس تلاش کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے

جب وہ اپنے آپ کو موت کی آغوش میں دیکھتا ہے۔فسادات کے دوران اس کے بیٹے اور بہو کو قتل کر دیا جاتا ہے۔دودھ پیتے پوتے کو مارنے کی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے۔وہ اپنے پوتے کو لے بھاگتا ہے۔پوتا پیاس سے نڈھال ہے۔وہ اس کو کھیتوں میں چھوڑ کر پانی کی تلاش میں رینگتا ہے۔وہ خود زخمی ہے۔ایک مقام پر پہنچ کر اسے لگتا ہے کہ دراصل وہ محض اپنے لیے پانی کی تلاش میں نکلا ہے اور وہ انتہائی خود غرض ہو گیا ہے۔یہاں تک کہ انسان کہلائے جانے کا بھی مستحق نہیں رہا۔وہ پیاس کی اس اذیت کے ہاتھوں ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔اس کے جسم کی توانائی ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو ذہنی حالت بھی ابتر ہو جاتی ہے۔عجیب وغریب سوچوں کا ایک طوفان سا ذہن میں اٹھتا چلا آتا ہے۔اور وہ سوچتا ہے:

''۔۔۔اور اگر مجھے پانی کا ایک گھونٹ مل جائے تو میں آن میں ساری کائنات پر حاوی ہو جاؤں۔۔۔اور ایک بہت اونچی چوٹی پر ایک بہت اونچا تخت بچھا کر ایک ایک انسان کو اپنے حضور بلاؤں اور اس کی کھوپڑی کو چٹخا کر اس کا گودا نگل جاؤں اور ہنستا جاؤں۔اس کی پسلیاں توڑ کر اپنی ازلی وابدی پیاس بجھاتا رہوں اور قہقہے لگاتا رہوں۔۔۔حتیٰ کہ اس دھرتی پر کوئی انسان باقی نہ رہے۔۔۔اور پھر میں اس زور سے چیخوں کہ پھیپھڑے میرے حلق سے گوشت کے ریزوں کی پھوار بن کر نکل جائیں اور پھر میں اس چوٹی پر سے نیچے اندھیری کھاڑیوں میں کود جاؤں۔۔۔اور مشیت ہاتھ ملتی رہ جائے اور ابلیس کو واپس آسمانوں پر بلا لیا جائے اور مٹی کے بت بنا کر ان میں پھڑ پھڑاتی ہوئی روحوں کو مقیّد کرنے کا کھیل پھر نہ دہرایا جائے۔''(۱۷)

انتظار حسین کے افسانے 'اجودھیا' کا مرکزی کردار ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے لیکن ہمیشہ اپنے دوست رمیش، رامچندی ریوڑی والے کی ریوڑیاں اور ہندوستان کے تہوار یاد کرتا رہتا ہے۔افسانہ اس کی یادوں کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور اسی دوران اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا عقیدہ ایمانی بھی واضح نہیں۔وہ نہیں جانتا ایمان کیا ہے؟ ہجرت کسے کہتے ہیں اور یہ کہ پاکستان آنے کے بعد اس کا مقام کیا ہے؟ کیوں کہ وہ محض اپنی جان بچاتا پاکستان آن پہنچا تھا۔لیکن یہاں آنے کے بعد اسے کوئی معاشی استحکام نہ مل سکا جس کی وجہ سے اس کا ایمان بھی متزلزل ہو جاتا ہے:

''۔۔۔یہ ایمان کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں محض ایک واہمہ ہے بے ایمانی بھی تو ایک طرح سے ایمان ہوتی ہے۔ٹوٹنے والا کفر سب سے زیادہ پختہ ایمان ہوتا ہے اور پھر ایمان کا ہجرت سے کیا ناطہ۔یہ ہجرت کا لفظ اسکے حلق سے اتر نہ سکا پھر وہ کون ہے۔۔۔مہاجر، مفرور، بھگوڑا، پناہ گزیں۔اسے ہلکا پھلکا سیدھا سچا لفظ بھگوڑا بہت پسند آیا ویسے بھی وہ ٹھیٹھ اردو لفظ تھا۔''(۱۸)

افسانہ 'اجودھیا' کی طرح ممتاز مفتی کے افسانے 'گھور اندھیرا' میں لوگ اس قدر نفسیاتی مسائل کا شکار نظر آتے ہیں کہ انھیں اپنے عقائد پر اعتبار ہی نہیں رہتا۔اس حوالے سے مختلف جملے اس افسانے میں دیکھے جا سکتے ہیں:

''''بھگوان'' تو نوجوان غصے سے بولا'' نہیں نہیں بھگوان تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔اب

تو یہاں شیطان بستے ہیں۔شیطان۔بھگوان کی دنیا میں اینٹوں سے شعلے نہیں نکلتے۔''''ہاں''امرسنگھ گنگنایا''یہ شیطان کی دنیا ہے بھاگ چلو بھاگ چلو۔''(۱۹)

''خدا کرے''کوچوان بولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''خدا''دوسری عورت کھلکھلا کر ہنسی۔''کاش کہ وہ کچھ کرسکتا۔کاش۔''(۲۰)

جب لنگوٹی والا درویش منش اپنے آپ کو انسان کہتا ہے تو اس کے منہ سے نکلتا ہے''بھگوان''۔اس پر عورت کہتی ہے:

''نہیں نہیں بھگوان نہیں انسان''وہ چلائی''میں جنم دے رہی ہوں۔''(۲۱)

لیکن کچھ لوگ اپنے عقائد میں اتنے مضبوط تھے کہ تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات بھی ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ لاسکے۔انتظار حسین کے افسانوی مجموعے''گلی کوچے''میں شامل افسانہ'خریدو حلوا بیسن کا'مرکزی کردار پھیری والا ہے جو بیسن کا حلوا بیچتا ہے اس افسانے میں فسادات سے قبل اور فسادات کے بعد کے حالات دکھائے گئے ہیں۔وہ گلی میں حلوا بیچنے آتا ہے اور کہتا ہے:

پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا
مسلمانوں نہ گھبراؤ شفاعت برملا ہوگی
پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوا بیسن کا
طبیبوں نے کیا ہے پاس ہمارا حلوا بیسن کا

یہ پھیری والا ایک مضبوط ارادے کا انسان تھا۔فسادات کے ہنگاموں کے دوران بڑوں بڑوں کے ایمان متزلزل ہوگئے لیکن اس تشویش ناک صورت حال میں بھی اس پھیری والے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔افسانہ نگار اس کے بارے میں کہتا ہے:

''وقت کا تو وہ بہت ہی پابند تھا۔نمازی کی نماز قضا ہوجائے اس کا آنا قضا نہ ہو۔آندھی ہو،بارش ہو اپنے اسی وقت پر آتا۔۔تھوڑی دیر بیٹھتا اور چلا جاتا۔اب یہی دیکھ لو کہ پچھلے دنوں کیا کیا فساد ہوا تھا۔دنیا ادھر سے ادھر ہوگئی۔لیکن اس کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔''(۲۲)

فسادات کے دوران ہونے والی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے لوگ نفسیاتی مسائل کا شکار ہورہے تھے۔ایک ڈر،خوف اور بے چینی کی فضا تھی۔فسادات کے ڈر سے لوگوں کے لبوں پر چپ کی مہر لگ گئی تھی لیکن اس پھیری والے پر یہ ہنگامہ آرایاں بھی کوئی اثرات مرتب نہیں کرتیں اور نہ ہی اسے یہ فکر ستاتی کہ یہ تمام لوگ کیوں پریشان ہیں؟ کیوں گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں:

''وہ اس اُدھیڑ بن میں کبھی نہیں لگا کہ کون گھبرایا ہوا ہے اور کیوں گھبرایا ہوا ہے اسے یہ کر یہ کبھی نہیں ہوئی محمد کے چہرے پر اب کیوں ہوائیاں اڑا کرتی ہیں اور چچا شیرو کیوں گھبرائے گھبرائے سے رہنے لگے ہیں اور جعفر کی زبان کو یہ ایک ساتھ تالا کیوں لگ گیا ہے وہ بیڑی کے اتنے لمبے لمبے کش لینے کے باوجود کیوں دون کی نہیں لیتا۔اسے اس بات پر بھی اعتراض نہیں ہوا کہ

چچا شیر و بھنے ہوئے چنوں کے نسخے کی کیوں برملا تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ تاہم وہ خود داب بھی یہی صدا لگائے جاتا تھا کہ ''پڑھو کلمہ محمد ﷺ کا خرید و حلوا بیسن کا'' ہاں یہ ضرور صحیح ہے کہ اس کی تھال کے گرد اب جمگھٹا بہت کم ہوتا تھا اور برابر کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔'' (۲۳)

مختلف نفسیات کے حامل کرِداروں کو پیش نظر رکھا جائے تو ''خرید و حلوا بیسن کا'' افسانے میں موجود کرِدار حلوا بیچتا ہے وہ خوف و ہراس کے دائرے سے خارج ہے۔ جس طرح فسادات سے پہلے حلوا بیچنے آتا تھا اسی طرح فسادات کے دوران بھی آتا رہا یہاں تک کہ مسلمانوں کا سارا محلّہ خالی ہو جاتا ہے لیکن اس کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح منٹو کا افسانہ ''یزید'' بھی ایسے کرِدار کریم داد کو پیش کرتا ہے جو مثبت سوچ کا حامل ہے۔ وہ چھوٹی عید اور بڑی عید کے تہوار بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے مناتا ہے۔ حال آں کہ بڑی عید سے بارہ روز قبل بلوائیوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیا تھا۔ جس کے دوران اس کا باپ رحیم داد اور اس کی بیوی جیناں کا بھائی فضل الٰہی قتل ہو گئے تھے۔

کریم داد کے گاؤں کے لوگ ابھی سن سینتالیس کے سود و زیاں کے حساب کتاب میں لگے تھے اور سوگ میں مصروف تھے، سارا گاؤں قبرستان کی گمان تھا۔ جب کریم داد نہایت دھوم دھڑ کے سے شادی کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے ''بازارِ حیات'' کے افسانے 'ہیرا' کا موضوع جنگ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کرِدار وریام لام میں جا کر مختلف محاذوں پر لڑ چکا ہے۔ وہاں جب وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ فوجی کس کس طرح مارے جاتے ہیں۔ ان کی بوٹیوں کی دھجیاں تک اڑ جاتی ہیں تو وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ انسان عزت کی موت مرے جیسے شاہزادی ہیرا چاٹ کہ مر جاتی ہے لیکن اسے احساس ہے کہ ایک غریب کی موت ہیرا چاٹ کر مرنے سے نہیں ہو سکتی لہٰذا وہ اپنی بیوی زینو سے کہتا ہے:

''۔۔۔امیر لوگ ہیرا چاٹ کر مرتے ہیں۔ امیروں کی موت بھی شاندار ہوتی ہے۔ کیسے مرا؟ بس ہیرا چاٹ کے مر گیا۔ ہاہاہا۔ یہ نہیں کہ ریل گاڑی کے نیچے آ گئے۔ انتڑیاں ایک پٹڑی پر ڈھیر پڑی ہیں سر دوسری پٹڑی کی طرف لڑھک گیا ہے اور چمڑا انجن کے پہیوں سے لپٹا جا رہا ہے۔۔۔تھوہ!'' (۲۴)

محاذ میں جب وہ اپنے دوست نواز کی لاش کی بوٹیاں دیکھتا ہے تو خوف کی وجہ سے نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے لہٰذا اسے واپس گھر بھجوا دیا جاتا ہے۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور وہ خود ساختہ گولیوں اور بموں سے بچنے کی کوشش میں نڈھال ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی اور غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر بالآخر ایک ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لیتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں خودکشی کا ارتکاب کرنا جرم ہے۔ وہ اپنے لیے ایسی موت کا انتخاب کر بیٹھتا ہے جس کے خوف میں وہ اپنی زندگی بھی برباد کر چکا تھا۔ چناں چہ جب اس کی بیوی سٹیشن تک پہنچی ہے تو قلی پہیوں سے وریام کے چمڑے کو الگ کر چکے تھے۔

''رگ سنگ'' میں شامل مسعود مفتی کے افسانے 'سپاہی' کا مرکزی کردار میجر نعیم جنگ کے دوران ہونے والے ایک حادثے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوران جنگ دشمن پر حملے کے دوران جب ایک پانچ

چھ سالہ بچی اس کی گولی کا نشانہ بن کر نہر میں گر کر مر جاتی ہے تو وہ بے اختیار اپنی کمین گاہ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔شادی کے بعد دس سال گزر جانے کے باوجود وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔یہ حادثہ اس کے اندر کی احساس محرومی کو مزید ابھارتا ہے۔میجر نعیم کی بیوی شاہدہ اس کی کیفیت بتاتے ہوئے واحد متکلّم کی بیوی سے کہتی ہے:

''۔۔۔ہسپتال سے واپسی پر نعیم کو اولاد کی محرومی کا بہت ہی زیادہ احساس ہو گیا ہے۔اب تو اسے گھر آئے چھ سات ماہ سے اوپر ہو گئے ہیں لیکن وہ دن بدن چھوٹے بچوں کا گرویدہ ہوتا جاتا ہے اور ہم سایوں کے بچے گھر میں اکھٹے کیے رہتا ہے۔شاید موت کے اتنے قریب جا کر اسے احساس ہوا ہوگا کہ میرے بعد میرا نام لیوا کوئی بھی نہ ہوگا۔''(۲۵)

اس کی بچوں پر شفقت کی وجہ سے اس کی بیوی میں بانجھ پن کا احساس کچوکے لگاتا ہے۔ان کی خانگی زندگی میں ایک خلا آنے لگتا ہے۔آخر میں میجر نعیم کو اپنے رویے کا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن بے قصور بچی کی موت اسے سسکیاں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایک نڈر بہادر فوجی جس نے دشمن کے کئی سپاہی مار بھگائے عجیب وغریب کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ایک گناہ کے احساس تلے دب کر رہ جاتا ہے اور اس کا مداوا کرنے کوشش میں اس کی گھریلو زندگی اثر انداز ہونے لگتی ہے۔

مسعود مفتی کے اسی افسانوی مجموعے میں افسانے 'نیا آدمی' کا مرکزی کِردار ایک عادی مجرم ہے۔لیکن جنگ کے دنوں میں ہونے والی تباہی کی وجہ سے اس کے اندر سویا ہوا جذبۂ حب الوطنی جاگ اٹھتا ہے۔وہ گجرانوالہ اور لاہور سے مال مویشی چُرا کر سیالکوٹ لے جاتا۔ وہ پاکستان کی سرحد کے پاس ہندوستان کے علاقے سے بھی مویشی چرا لایا کرتا تھا اور اس میں تعصّب کو بڑا دخل تھا۔اپنا یہ کارنامہ بڑے فخر سے جیل میں لوگوں کو بیان کرتا ہے۔

''ان میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔دن دھاڑے ان کی ماں اٹھالاتے تھے۔اور ہیجڑے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔''

ماں؟ کوئی پوچھتا۔

''ہاں ہاں گائے ماتا۔ان کی ماں ہی ہوئی۔''سب ہنسنے لگتے۔''(۲۶)

اس کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان والے سرحد کے حصار کو توڑ کر پاکستان نہیں آ سکتے لیکن آج جب کہ اس کی پیشی تھی،وہ کچہری کی دیوار کو دیکھتا ہے جو ہندوستانی بم سے تباہ ہو چکی ہے۔اسے شدید صدمہ پہنچتا ہے۔جب وہ خبروں میں سنتا ہے کہ ہندوستان اپنی چھاپہ مار فوج پاکستانی علاقے میں اتار رہا ہے تو اس کے اندر ایک نیا آدمی پیدا ہوتا ہے۔ یہ دکھ اس کے اندر کے انسان کو تبدیل کر دیتا ہے۔وہ عادی مجرم کی بجائے ملک وقوم کا وفادار اور ذمہ دار شہری بن جاتا ہے۔ساری عمر اس نے اپنے اور پرائے لوگوں پر حملہ کیا تھا لیکن آج وہ اپنے ملک کے لوگوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔انھیں ہندوستانی فوج سے بچانا چاہتا تھا۔اسے پولیس کے لوگ بھی اپنے ہم درد لگنے لگتے ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مخالف گواہ جو کچہری کے احاطے میں کھڑے تھے اس کے اپنے تھے۔ہندوستان جب ہوائی

حملہ کرتا ہے تو وہ ہتھکڑی چھڑا کر ان جہازوں کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ بھاگتا چلا جاتا ہے تاکہ پیراشوٹ سے اترنے والے سپاہیوں کا خاتمہ کر سکے۔ اس کے اندر ہونے والی تبدیلی کے بارے میں افسانہ نگار لکھتا ہے:

''پرانا عادی مجرم صرف اپنی ذات اور اپنے منافع کا خیال کیا کرتا تھا اور دوسروں کا مال ضمیر کی ذراسی ہچکچاہٹ کے بغیر اٹھالاتا تھا۔ دوسرا انسان اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اخلاقیات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ ڈاکہ مارنے کے دوران میں اگر کوئی مزاحم ہوتا تو وہ چمکیلی کلہاڑی سے ٹکڑے کرنے میں ذرا بھی دریغ نہ کرتا۔ اپنی ذات اور اپنے فائدے کے علاوہ اس نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ مگر اب یہ عادی مجرم غائب ہو رہا تھا۔ اس کی جگہ نیا آدمی اس کے دماغ میں کروٹیں لے رہا تھا جس کو یہی صدمہ تھا کہ ہندوستانی چھتریوں سے اتر کر اس علاقے کے لوگوں کو تباہ کریں گے۔۔۔ اس حصار کو توڑ دیں گے جس میں وہ رہتا تھا۔''(۲۷)

افسانے کے آخر میں جب دوبارہ پاکستانی پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے اور اسے مارتی اور گالیاں دیتی ہے تو اس کے اندر کے وفادار انسان کا وجود جو عارضی طور پر بیدار ہوا تھا ختم ہونے لگتا ہے اور پرانا عادی مجرم سر اٹھانے لگتا ہے۔ یہ تو ایک عام آدمی کی کہانی تھی جو مجرم تھا۔ اس حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک اپنے مضمون ''تحریکِ آزادی کشمیر! اردو ادب کے آئینے میں'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ لاہور کے شہریوں نے اپنی مسلح افواج کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر شجاعت اور جان بازی کے وہ کارنامے سرانجام دیے کہ قرونِ اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ خارجی زندگی کی اس اچانک کایا پلٹ کی بدولت ہمارے تخلیقی ادب کی آنکھوں کی کھوئی ہوئی چمک بھی دوبارہ لوٹ آئی جن تلازمات و محاکات، جن علائم و رموز اور جس قومی و ملّی طرز احساس کو گزشتہ ربع صدی کے دوران ہمارے ادیب نے بڑی محنت کے ساتھ فراموش کیا تھا وہ ہمارے ادیب کی تخلیقی کارگاہ میں سیلاب کی مانند آئے۔''(۲۸)

انتظار حسین کے افسانوی مجموعے ''کچھوے'' میں شامل افسانے 'نیند' کا مرکزی کردار مسلمان سقوطِ ڈھاکا کے بعد وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پاکستان پہنچنے پر اس کے دوست احباب ظفر، اسلم اور زیدی اس سے سفر کی گذشت سننا چاہتے ہیں لیکن وہ انھیں تفصیلات بتا نہیں پاتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا ذہن تھک چکا ہے۔ اس کی یادداشت کمزور ہو چکی ہے۔ اس دوران ظفر، اسلم اور زیدی میں سیاسی حالات کے حوالے سے بحث چھڑ جاتی ہے۔ اسلم کہتا ہے:

''۔۔۔ لوگوں کو انھوں نے کیسی کیسی اذیتیں دے کر مارا ہے۔۔۔ بوڑھوں کو، بچوں کو۔۔۔ وحشی۔۔۔ درندے۔۔۔ میرا بس چلے تو میں انھیں۔۔۔'' اس نے دانت کچلچائے۔

''انھیں یہی کرنا چاہیے تھا'' زیدی نے اعلان کیا۔

''یہی کرنا چاہیے تھا؟'' غصہ سے بولا۔

''ہاں ہم پچیس سال تک ان کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے تھے اس کے بعد انھیں یہ ہی کرنا چاہیے تھا۔''

''کیا کرتے رہے تھے۔کیا کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ'' اسلم غصہ سے چلایا۔''(۲۹)

ان کے اس مباحثے میں سلمان بار بار غنودگی میں چلا جاتا ہے اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہ سو جاتا ہے کیوں کہ وہ اس دوران جس ذہنی اذیت اور کرب سے گزا تھا وہ سو نہیں سکا تھا۔اسے یاد بھی نہ تھا کہ وہ کتنی راتیں جاگتا رہا ہے۔اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان راتوں میں وہ کبھی سویا بھی تھا کہ نہیں۔

انتشار اور بدنظمی کے زمانے میں قتل اور خوں ریزی کس طرح لوگوں کی ذہنی صحت پر اثرات مرتب کرتی ہے یہ مسعود مفتی کے افسانے 'جال' کا بنیادی موضوع ہے۔یہ افسانہ ان کے مجموعے ''ریزے'' میں شامل ہے۔اس افسانے کا مرکزی کِردار جو کہ جنگی قیدی ہے ایک کیپٹن کی زندگی کے دروا کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کس طرح ایک نارمل انسان حالات سے تنگ آ کر ابنارمل ہو جاتا ہے۔ڈھاکا چھاؤنی میں وہ تین کمروں کے اس مکان میں مقیّد تھا جہاں کبھی کیپٹن رہائش پذیر تھا۔ وہاں اسے کیپٹن کی بیوی کے چند خطوط ملتے ہیں جس سے وہ کیپٹن کے حالات زندگی کا تانا بانا بنتا ہے۔

کیپٹن مارچ ۱۹۷۱ء کو جب ڈھاکا گیا اس وقت تک اس کی شادی کو تین سال گزر چکے تھے لیکن کوئی بچہ نہ تھا۔بیوی مغربی پاکستان میں رہائش پذیر تھی۔ان کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا کہ مکتی با ہنی والوں نے اسے اغوا کر لیا۔پاکستانی فوج کے اچانک پہنچنے پر وہ بال بال بچ گیا۔دو ہفتے بعد اس کی گاڑی پر پھر حملہ ہو جاتا ہے جس میں اس کا ساتھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ان دو واقعات کا کیپٹن پر ایسا اثر ہوا کہ نہ صرف اپنی بیوی کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا بل کہ اپنے دوست پر اپنے قتل میں ملوث ہونے کا الزام بھی لگا دیا کیوں کہ وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہا تھا وہ کسی بھی نارمل شخص کو ابنارمل بنانے کے لیے کافی تھی:

''۔۔۔اسی طرح ڈھاکا کی فضا میں ڈر، بے یقینی، درماندگی، بے دلی اور ویرانی کا ملا جلا طلسم چھایا ہوتا تھا۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے خوف کھاتا تھا۔زندگی کی ہر سانس ایک مصنوعی عمل لگتا تھا۔جو کسی بھی دم بکھر جانے کے خطرے سے دوچار رہتا۔''(۳۰)

ڈر، بے یقینی، درماندگی بے دلی اور ویرانی جیسی کیفیات انسان میں مایوسی پیدا کر دیتی ہیں یہاں تک کہ انسان خودکشی جیسے جرم کا ارتکاب کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔افسانے کے مرکزی کِردار نے قید کے دوران کیپٹن کے بارے میں جو کھوج لگائی اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ آخری وقت میں بہت بہادری کے ساتھ لڑتا رہا لیکن پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے اور شکست خوردگی نے اسے اتنا مایوس کر دیا کہ مکتی با ہنی کے حملوں کے دوران ایک دم اپنی کمین گاہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔اس کے ساتھیوں کا غالب گمان یہی تھا کہ اس نے شکست کی مایوسی میں خودکشی کی۔اس قسم کے حالات پر جس میں انسان نفسیاتی مریض بن جاتا ہے تبصرہ کرتے ہوئے ایک افسر کہتا ہے:

''۔۔۔مگر میں تو یہ کہوں گا کہ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سے مشرقی پاکستان کی ساری فضا ہی ایسی ہوگئی تھی جس میں صرف وہم پلتا تھا۔ جہاں آدمی کو بالکل پتا نہ ہو کہ کس وقت کس طرف سے اس پر حملہ ہو جائے گا اور کون آدمی کس انداز میں اسے دھوکا دے گا وہاں وہم نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔۔۔ایک طرف خارجی حالات اور دوسری طرف داخلی ذہنی کیفیت، یہ دونوں مل کر ایسا پیچیدہ جال بن دیتے تھے جس سے نکلنے کے لیے انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہی رہتا ہے۔ مگر نکل نہیں سکتا۔ مورچے یا میدان کی لڑائی ہو تو فوجی اپنی بہادری کے بل بوتے پر ہر صورت حال کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن دشمن نظر سے اوجھل ہو۔ گولی کی سمت کا اندازہ نہ ہو تو وہم جوان ہونے لگتے ہیں۔''(۳۱)

یہی وجہ تھی کہ مکتی باہنی سے آزاد ہونے کے بعد کیپٹن اتنا خوفزدہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کا دیا ہوا کھانا نہ کھاتا اور یہ کہتا کہ اس میں زہر ملا ہے۔ اصل میں سقوطِ ڈھاکا کے وقت حالات ایسے تھے کہ لوگوں کے ذہن اور سوچ کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس افسانے میں کیپٹن کی ذاتی اور خارجی احوال کا بیان کرتے ہوئے اس کے رویے میں آنے والی تبدیلی کو عیاں کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ ایک ذہین اور بہادر انسان تھا اور پھر وہ مختلف واہموں کا شکار ہو گیا۔

'ذاتی المیے اور قومی المیے کا سنگھم کسی بھی حساس فرد کو بھسم کر سکتا تھا۔''(۳۲)

ایک انسان میں بھی حیوان اور درندے کی صفات موجود ہوتی ہیں۔ حالات اس کے اندر کے وحشی انسان کو بربریت پر اُکساتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان محض اس لیے انسان ہے کیوں کہ اسے تہذیب کے کھونٹے سے باندھ دیا گیا ہو۔ جوں ہی اسے موقع ملتا ہے اس کے اندر کا غیر مہذب انسان نمودار ہوتا ہے مسعود مفتی کے افسانے 'تشنگی' کا یہی موضوع ہے۔ سقوطِ ڈھاکا کے ساتھ ہی آتش زدگی، لوٹ مار، قتل وغارت گری، اور اغوا جیسے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نفرت اور تعصّب کے علاوہ انسان کے اندر چھپا بیٹھا حیوان بھی اس انتشار اور بدنظمی میں حصہ دار ہے۔ اس قسم کے حالات میں ہر انسان موقع کی تلاش میں ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار منجو انسان کی مختلف نوعیت کی نفسیات کا حامل ہے۔ سقوطِ ڈھاکا کے بعد مقامی اور غیر مقامی جھگڑے میں ہونے والی خوں ریزی کے نتیجے میں لاشوں کو ندی میں پھینک دیا جاتا۔ وہ ندی میں پہلی بار لاش کو دیکھتا ہے تو اسے ندی کے پل پر سے ایک بانس کے ذریعے چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس روز ندی میں سے سات لاشیں بہتی دیکھی گئیں۔ لاشوں کا نظارہ اسے غیر معمولی دکھائی دیتا ہے۔ اسے اپنے اندر توانائی محسوس ہوتی ہے اور وہ گھر کے سامنے رہنے والی محبوبہ پر جھپٹ پڑتا ہے اس کے بعد وہ ایک بوڑھے کی لاش دیکھتا ہے کچھ دنوں بعد ایک برہنہ عورت کی لاش نے اس کو اور اس کے دوستوں کو توجہ کا مرکز بنایا۔ اس نے بانس سے لاش کو چھوا تو وہ ایک نئے قسم کے احساس سے آشنا ہوا لیکن لاش ریلے میں بہہ گئی:

''منجو کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے کھولتے ہوئے پانی سے نکال کر برف کی سل کے نیچے دبا دیا

ہے۔اس کا اپنا جسم کارواں رواں لرز رہا تھا۔۔۔ایک عجیب قسم کی تشنگی اس کے تالو سے آندھی بن کر اٹھی۔کانوں کے پردے سنسنا گئی اور گلے کے نرخرے میں پھنس کر رہ گئی۔۔۔وہ چند لمحوں کے لیے منجمد ہو کر رہ گیا۔''

''منجو نے یوں محسوس کیا جیسے حسرت مایوسی اور بے بسی سے اس کے اپنے جسم کے ہر مسام سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں اور تشنگی کا احساس اس کے پیٹ میں مروڑ بن کر اٹھ رہا ہے۔''(۳۳)

فسادات کے پس منظر میں لکھے جانے والے منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' کے برعکس اس افسانے کے کِردار میں لاش کو دیکھ کر ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ایشر سنگھ تو جنسی نامردی کا شکار ہو جاتا ہے اور زندہ عورت سے بھی دور بھاگتا ہے لیکن اس فسانے کے کِردار میں بالکل مختلف نوعیت کی تبدیلی آتی ہے۔ جو لطف اسے لاشوں کو چھونے سے حاصل ہوتا ہے وہ اس کی تشنگی کو بڑھا دیتا ہے۔اس کی محبوبہ بھی اس میں وہ حرارت اور حدت پیدا نہیں کر پاتی جو لاشیں کرتی ہیں۔اپنی محبوبہ زائرہ کا قرب بھی اس میں وہ تڑپ اور مچل پیدا نہیں کرتا جو لاشوں نے کیا تھا۔اس کی طبیعت میں بوجھل پن،اداسی اور بے گانگی عود آتی ہے۔

حالت جنگ میں ایک انسان جس قسم کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے ان کو بڑے موثر انداز سے ان افسانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ایسے بھی کِردار ملتے ہیں جو مرنے کے ڈر سے موت کی آغوش میں پناہ لے لیتے ہیں۔ایسے کِرداروں کو بھی پیش کیا گیا ہے جن کے تصوراتِ میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو کہ انسانی نفسیات کا خاصہ ہیں۔ذہنی آسودگی ایک معروضی قدر ہے۔نفسیاتی مسائل کے شکار لوگوں کی وجہ سے معاشرے میں مزید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔نفسیاتی مسائل کا حل قربِ الٰہی ہے۔خدا کی عبادت انسان کو روحانی سکون عطا کرتی ہے۔تصوف میں بھی روحانیت پر زور دیا جاتا ہے تا کہ انسان ذہنی طور پر پرسکون زندگی گزار سکے۔معاشی خوش حالی بھی انسان کے ذہنی سکون کا باعث بنتی ہے۔مختلف معاشروں میں معاشی آزادی کے لیے مختلف کاوشیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔فلسفہ جمال کی رو سے انسان کی شخصیت میں ہم آہنگی ،تناسب،اعتدال،موزونیت اور پاکیزگی انسان کو پریشانیوں سے نجات دلاتے ہیں۔اس کے برعکس ناپاک جذبات بیمار تخیلات،مکروہ خواہشات اور حق وصداقت سے انکار انسان کو نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔نفسیات کا علم بھی انسان کو ذہنی مسائل سے چھٹکارے کے لیے مختلف تدابیر بتاتا ہے۔ہمارے معاشرے میں سیاسی ومعاشی اور معاشرتی جکڑ بندیوں کی وجہ سے انسان مسلسل ذہنی انتشار کا شکار ہے۔چنانچہ یہ امر طے شدہ ہے کہ انسان کو انسانیت کے درجے پہ فائز ہونے کے لیے بھی ایک صحت مند معاشرہ درکار ہے۔

حوالے:

(۱) ساجدہ زیدی:انسانی شخصیت کے اسرار و رموز،لاہور:یو پبلشرز،۲۰۰۶ء،ص۱۰۳
(۲) ڈاکٹر نعیم احمد: فرائیڈ کی تحلیلِ نفسی،لاہور:مشعل بکس،۲۰۰۶ء،ص۳۳
(۳) ایضاً ، ص۳۴
(۴) ایضاً ، ص۳۶،۳۷
(۵) ایم اے قریشی:فرائڈ اور لاشعور،لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۰۷ء،ص۸۴
(۶) ڈاکٹر نعیم احمد:فرائیڈ کی تحلیلِ نفسی،ص۴۳
(۷) ڈاکٹر انور سجاد:مجموعہ ڈاکٹر انور،لاہور؛سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص۱۵۹
(۸) ایضاً ، ص۳۷
(۹) شیخ محمد غیاث الدین:فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے(۱۹۴۸ء تا۱۹۸۷ء)،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،س ن،۳۲۷
(۱۰) منٹو،سعادت حسن:ٹھنڈا گوشت،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸،ص ۶۷ تا۷۵
(۱۱) انتظار حسین:گلی کوچے،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء،ص۲۴،۲۵
(۱۲) اے حمید:کچھ یادیں کچھ آنسو،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص۱۷۸،۱۷۹
(۱۳) ڈاکٹر فرمان فتح پوری:اردو نثر کا فنی ارتقاء،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء،ص۴۰
(۱۴) قدرت اللہ شہاب:یاخدا،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء،ص۱۸
(۱۵) ایضاً ، ص۲۰
(۱۶) ایضاً ، ص۲۰-۲۱
(۱۷) احمد ندیم قاسمی:درو دیوار،لاہور:اساطیر پبلشرز،۱۹۹۵ء،ص۲۱،۲۲
(۱۸) انتظار حسین:گلی کوچے،ص۶۲،۶۳
(۱۹) ممتاز مفتی:اسمارائیں،لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،۲۰۰۸ء،ص۲۳۳
(۲۰) ایضاً ، ص۲۴۶
(۲۱) ایضاً ، ص۲۴۶
(۲۲) انتظار حسین:گلی کوچے،ص۳۴
(۲۳) ایضاً ، ص۳۶
(۲۴) احمد ندیم قاسمی:بازار حیات،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸،ص۱۷۶
(۲۵) مسعود مفتی:رگ سنگ،اسلام آباد:اقرا،۱۹۷۸ء،ص۸۷
(۲۶) ایضاً ، ص۸۸
(۲۷) ایضاً ، ص۹۱
(۲۸) پاکستان میں اردو:(مرتبین)فتح محمد ملک ودیگر،پاکستان:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۶ء،جلد۵،ص۳۱۶

(۲۹) انتظار حسین: کچھوے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷

(۳۰) مسعود مفتی: ریزے، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۵۶

(۳۱) ایضاً ، ص ۴۶

(۳۲) ایضاً ، ص ۵۱

(۳۳) حسن عباس رضا: (مرتب) فسادات کے افسانے، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۳